رائے، اہلِ رائے اور فقہائے حنفیہ!

مفتی عبید الرحمٰن
مایار، مردان

''رائے'' کا مفہوم وتعارف

''رائے'' کا لفظ عربی زبان میں تجویز ومشورہ، خیال واعتقاد، عقل وتدبیر اور غور وفکر وغیرہ معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ''اہلِ رائے'' کا لفظ ان افراد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو رائے کے ساتھ زیادہ ربط وتعلق رکھتے ہیں۔ دریافت طلب سوال یہ ہے کہ:

الف: اہلِ رائے کن لوگوں کو کہا جاتا ہے؟ کون اس لفظ کا مصداق بنتے ہیں؟

ب: اس کی حیثیت ومقام کیا ہے؟ کیا یہ مدح ومنقبت کا لفظ ہے یا مذمت کا عنوان ہے؟

ان دونوں باتوں کی تہہ تک پہنچنے کے لیے خود ''رائے'' کے لفظ کی حقیقت اور اس کی حیثیت ومقام کو جاننا ضروری ہے۔ اہلِ علم کے ہاں رائے کا لفظ مختلف مفاہیم ومقاصد کے لیے استعمال ہوتا ہے، کبھی تو تردید ومذمت کے طور پر اس کا استعمال کیا جاتا ہے، جبکہ بسا اوقات مدح وتعریف کے سیاق میں اس کا اطلاق ہوتا ہے، جہاں مذمت مقصود ہو وہاں اس کا مقصود کچھ ہوتا ہے اور جہاں مدح ومنقبت کے سیاق میں واقع ہو، وہاں اس کا پس منظر کچھ اور ہوتا ہے، یہ کیسے متصور ہوسکتا ہے کہ ایک ہی چیز کو ایک ہی وقت اچھا بھی کہا جائے اور بُرا بھی قرار دیا جائے!

علامہ ابن القیمؒ کی تحقیق

علامہ ابن قیم الجوزیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مفید کتاب ''إعلام الموقّعین'' میں اپنے مزاج ومذاق کے مطابق اس پر بڑی تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے، اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

''وإذا عرف هٰذا فالرأي ثلاثة أقسام: رأيٌ باطل بلا ريب، ورأيٌ صحيح، ورأي هو موضع الاشتباه، والأقسام الثلاثة قد أشار إليها السلف، فاستعملوا الرأي الصحيح، وعملوا به وأفتوا به، وسوغوا القول به،

وذموا الباطل، ومنعوا من العمل والفتيا والقضاء به، وأطلقوا ألسنتهم بذمهٖ وذم أهلهٖ.

والقسم الثالث: سوغوا العمل والفتيا والقضاء بهٖ عند الاضطرار إليه حيث لا يوجد منه بد، ولم يلزموا أحدا العمل بهٖ، ولم يحرموا مخالفتهٗ، ولا جعلوا مخالفهٗ مخالفًا للدين، بل غايتهٗ أنهم خيروا بين قبولهٖ وردهٖ؛ فهو بمنزلة ما أبيح للمضطر من الطعام والشراب الذي يحرم عند عدم الضرورة إليه.''(۱)

ترجمہ:''اسی بنا پر رائے کی تین قسمیں ہیں: باطل رائے، صحیح رائے اور مشتبہ رائے۔ ان تینوں اقسام کی طرف سلف نے اشارہ کیا ہے۔ رائے صحیح کو استعمال کیا ہے، اس پر عمل کیا ہے اور اس پر فتویٰ دیا ہے، اور اس کو جائز قرار دیا ہے۔ اور باطل رائے کی مذمت بیان کر کے اس پر عمل کرنے، اس پر فتویٰ دینے اور اس پر فیصلہ کرنے سے منع کیا ہے، اور رائے اور اہل الرائے کی خوب مذمت کی ہے۔

اور تیسری قسم پر اضطرار کے وقت جب کوئی دوسرا چارہ نہ ہو عمل، فتویٰ اور قضاء کو جائز قرار دیا ہے، اور کسی پر اس پر عمل کرنے کو لازم نہیں سمجھا اور نہ اس کی مخالفت کو حرام کہا ہے اور نہ اس کے مخالف کو دین کا مخالف کہا ہے، بلکہ اس کے قبول کرنے اور نہ کرنے میں اختیار دیا ہے، جس طرح حالتِ اضطرار میں مضطر کے لیے حرام چیز بقدرِ ضرورت حلال ہو جاتی ہے۔''

اس کے بعد غلط و مذموم رائے کی پانچ مختلف قسمیں اور درست رائے کی چار متنوع صورتیں اور متعلقہ تفصیلات ذکر فرمائی ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ:

❶۔''رائے'' کوئی ایسا شجرہ ممنوعہ نہیں ہے جو بہر حال مذموم و ممنوع ہی ہو۔

❷- اسی طرح یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ سلف صالحین نے جہاں ''رائے'' یا ''اہلِ رائے'' کی مذمت کی ہے، اس سے ایک مخصوص قسم کی رائے ہی مراد ہے، جس کی مذمت بالکل بجا بلکہ دینی حدود کی حفاظت کے لیے ضروری ہے۔

❸-''رائے'' کا استعمال صرف فقہائے/حنفیہ یا متاخرین علماء نے ہی نہیں کیا، بلکہ سلف کے ہاں اس کا معمول رہا ہے۔ علامہ ابن قیم مرحوم کی صراحت کے علاوہ بھی یہ تینوں باتیں ایسی ہیں جن کا کسی منصف مزاج عقل مند شخص سے انکار متصور نہیں ہے۔

رائے کی حیثیت جاننے کی کسوٹی

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ ''رائے'' کی کونسی قسم مذموم و ممنوع ہے اور کونسی نوع ممدوح و مطلوب؟ ان اقسام کو جاننے کا معیار و مدار کیا ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مختلف اہلِ علم نے اس پر مختلف انداز میں گفتگو فرمائی ہے۔ خود علامہ ابن القیمؒ نے درج بالا عبارت کے بعد اس پر بڑے بسط و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ تاہم اصولی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو درج ذیل دو نکات کو سامنے رکھ کر کسی رائے کی حیثیت و مقام معلوم کیا جا سکتا ہے:

الف: ''رائے'' کی بنیاد و اساس کیا ہے؟ کیا رائے کی عمارت ایسے امور پر استوار ہے جن کو شرعی دلیل کا درجہ حاصل ہے؟ یا ان کے علاوہ ظن و تخمین اور اتباعِ ہویٰ وغیرہ ایسے امور پر رائے کی بنیاد کھڑی ہے جن کو شرعی دلیل کا مرتبہ حاصل نہیں ہے؟

ب: ''رائے'' کا مقصود و غرض کیا ہے؟ کیا اس کی بنیاد پر کسی غیر منصوص درپیش مسئلہ کا شرعی حکم دریافت کرنا منظور ہے؟ یا کسی منصوص حکم میں تغیر و تبدیلی کرنی مطلوب ہے؟

اب اگر کوئی رائے ایسی ہو جو درج بالا دو شقوں میں سے پہلی پہلی شق کی حامل ہو تو وہ رائے درست ہے، ورنہ تو درست نہیں ہے، لہٰذا اس کے مطابق اگر کوئی رائے ایسی ہو جس میں درج بالا دونوں شرطیں پائی جائیں، یعنی ایک تو اس کی بنیاد کسی ایسی چیز پر ہو جس کو شرعی نقطۂ نظر سے دلیل کا درجہ حاصل ہو اور ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی وجہ سے کسی منصوص حکم کو نہ چھوڑا جائے تو ان دو شرائط کے ہوتے ہوئے جو ''رائے'' ہوگی، وہ قابلِ قدر اور درست ہوگی اور اگر دونوں میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو وہ رائے ممنوع و مذموم ہے۔

''اہلِ رائے'' کی اصطلاح کے مختلف استعمالات

اہلِ علم کی کتابوں میں جہاں ''اہلِ رائے'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، وہاں اس کے سیاق و سباق اور اس کے متقابل و متضاد پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور ان باتوں کو دیکھ کر ہی اصل مقصود تک رسائی ممکن ہے، چنانچہ:

①- بعض اوقات تو یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو محض اپنے گمان و تخمین سے شرعی احکام ثابت کرنے کی جسارت کرتے ہیں، قرآن و حدیث کی طرف مراجعت کرنے اور وہاں پیش آمدہ مسئلہ کا حکم معلوم کرنے کی زحمت ہی نہیں اُٹھاتے۔

②- بسا اوقات یہ اصطلاح ان بے نصیب قسم کے لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو قرآن و حدیث کے منصوص مسائل کو بھی اپنی عقلِ ناتواں کی کسوٹی پر پرکھ کر جانچتے ہیں اور اس پیمانے پر پورا اُترنے کے بعد ہی اس کو تسلیم کرنے کی زحمت کرتے ہیں۔

③- بعض جگہ یہ عنوان ''اہلِ حدیث'' کے متقابل کے طور پر ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے صرف حدیث کے الفاظ یاد کرنے ہی کی مہارت نہ دی ہو، بلکہ ساتھ تفقُّہ کی عظیم دولت سے بھی نوازا ہو۔

④ -بعض مقامات پر اس کا اطلاق فقہائے کرام کے طبقے میں سے بھی سب پر نہیں ہوتا، بلکہ ان میں سے خاص انہی حضرات پر ہوتا ہے جن کو علمی سطح پر خاص طور پر یہ ذوق نصیب ہوا ہے اور عملی سطح پر وہ اس کے ساتھ زیادہ اعتنا رکھتے ہوں۔

اہلِ رائے کا مصداق

اب پہلے دو معانی کے لحاظ سے یہ عنوان مذمت کا ہے اور جو لوگ اس معنی میں اہلِ رائے کہلاتے ہیں، وہ گمراہی کے شکار ہیں۔ تیسرے مفہوم کے لحاظ سے یہ اصطلاح چاروں ائمہ مجتہدین کے لیے استعمال ہوتی ہے، البتہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں چونکہ عام طور پر حدیث کے ظاہر پر عمل ہوتا تھا، اس لیے اُن کو اس سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابن عبدالبرّ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہائے مجتہدین متبوعین کے حالات پر جو کتاب لکھی، اس میں آپؒ کا تذکرہ نہیں فرمایا، بلکہ اس کا نام ہی یہ رکھا: ''الانتقاء في فضائل الأئمة الثلاثة الفقهاء''۔ چوتھے استعمال کے لحاظ سے یہ لفظ عام طور پر حضرات فقہائے احناف کے لیے استعمال ہوتا ہے، جبکہ بعض اوقات ان کے ساتھ موالک اور بسا اوقات شوافع کو بھی ملایا جاتا ہے۔

بہرحال آخری دونوں مفہوموں کے لحاظ سے اہلِ رائے کا لفظ لائقِ تعریف اور قابلِ مدح ہے، یہ کسی مذمت یا ممانعت کا باعث نہیں ہے۔ خلافتِ عثمانیہ کے نائب شیخ الاسلام علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ اپنی ایک مفید تحریر ''فقه أهل العراق'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''فالرأي بهٰذا المعنى وصفٌ مادحٌ يوصف به كل فقيه، ينبئ عن دقة الفهم، وكمال الغوص. ولذٰلك تجد ابن قتيبة يذكر في "كتاب المعارف" الفقهاء بعنوان أصحاب الرأي، و يَعدُّ فيهم الأوزاعي، وسفيان الثوري، ومالك بن أنس رضي الله عنهم. وكذٰلك تجد الحافظ محمد بن الحارث الخشني يذكر أصحاب مالك في "قضاة قرطبة" باسم أصحاب الرأي. وهٰكذا يفعل أيضاً الحافظ أبو الوليد بن الفرضي في "تار يخ علماء الأندلس.''

ترجمہ: ''اس معنی کے لحاظ سے ''رائے'' ایک اچھی صفت ہے جس سے ہر فقیہ متصف ہوتا ہے، جو اچھی فہم اور کمالِ تجربہ کی دلیل ہے، چنانچہ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی ''کتاب المعارف'' میں فقہاء کرام کو اصحابِ رائے کے عنوان سے ذکر کرتے ہیں، جن میں امام اوزاعی، سفیان ثوری، امام مالک بن انس رحمہم اللہ کو بھی گردانتے ہیں۔ نیز امام حافظ محمد بن حارث خشنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''قضاةُ قرطبة'' میں امام مالکؒ کے اصحاب کو بھی ''اہلِ رائے'' کے نام سے ذکر کرتے ہیں،

نیز حافظ ابوالولیدؒ کا طرزِ عمل بھی اپنی کتاب تاریخ علماء اندلس میں یہی ہے۔''

اس کے کچھ سطر بعد فرماتے ہیں:

''وأما تخصيص الحنفية بهٰذا الاسم، فلا يصح إلا بمعنى البراعة البالغة في الاستنباط، فالفقه حيثما كان يصحبه الرأي، سواء كان في المدينة أو في العراق.''(۲)

ترجمہ: ''فقہاء حنفیہ کو خصوصی طور پر اہلِ رائے میں سے شمار کرنا بھی کمالِ استخراج واستنباط کی بنیاد پر ہے۔ فقہی مسائل کے ساتھ لگاؤ جن کا بھی ہوگا مدینہ میں ہو یا عراق میں، وہاں رائے اور اجتہاد کا تذکرہ ہوگا۔''

لیکن علمی دیانت اور اصولی مہارت کے قحط یا فقدان کا کرشمہ ہے کہ ان جیسی اصطلاحات میں خلط ملط سے کام لے کر قابلِ تعریف پہلو لائقِ مذمت اور باعثِ مذلت گردانا جاتا ہے اور بعض اوقات اس قدر زور وقوت کے ساتھ یہ اشکال اُٹھایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے مخاطب حق پر ہونے کے باوجود بھی اس سے شعوری یا غیر شعوری طور پر براءت کرنے پر ایک گونا مجبور ہوتا ہے۔ اس جہاں کی نیرنگی کا کیا کہئے کہ بسا اوقات کوئی کارِ خیر اور عنوانِ فضل وکمال بھی باعثِ ننگ وعار بن جاتا ہے! حنفیہ کو اہلِ رائے کیوں کہا جاتا ہے؟ اس حوالہ سے علامہ عبدالعزیز بخاری رحمۃ اللہ علیہ امام بزدوی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''وهم أصحاب الحديث والمعاني، أما المعاني فقد سلم لهم العلماء أي سلموها لهم إجمالًا وتفصيلًا أما إجمالًا؛ فلأنهم سموهم أصحاب الرأي تعبيرًا لهم بذٰلك، وإنما سموهم بذٰلك لإتقان معرفتهم بالحلال والحرام واستخراجهم المعاني من النصوص لبناء الأحكام ودقة نظرهم فيها وكثرة تفريعهم عليها وقد عجز عن ذٰلك عامة أهل زمانهم فنسبوا أنفسهم إلى الحديث وأبا حنيفة وأصحابَهُ إلى الرأي.''(۳)

ترجمہ: ''اور وہ اصحابِ حدیث ومعانی ہیں اور علماء نے ان معانی کو اجمالاً اور تفصیلاً ان کے سپرد کیا ہے، اسی وجہ سے ان کو اصحابِ رائے کہا گیا ہے اور یہ لوگ اچھی طرح حلال اور حرام کو جانتا ہے اور احکام کی بنا کے لیے نصوص سے معانی نکال کر اس میں دقیق نظر کر کے اس پر تفریعات کرتے ہیں، اور جب اس سے عام اہلِ عصر عاجز ہوئے تو اپنی نسبت حدیث کی طرف کی اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کی نسبت رائے کی طرف کی اور ان کو اصحابِ رائے کہا۔''

کیا قیاس رائے ہے؟

فقہائے کرام کو عموماً اور حضرات حنفیہ کو خاص طور پر جو اہلِ رائے کہا جاتا ہے، وہ قیاس کے

استعمال کرنے اور اس کے ذریعے شرعی احکام کے استنباط واستخراج کرنے کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بات تسلیم شدہ ہے اور اصولی کتابوں میں بار بار اس کی تصریح بھی کی جاتی ہے کہ قیاس محض ''مُظہِرِ حکم'' ہوتا ہے ''مُثبِتِ حکم'' نہیں ہوتا، یعنی قیاس کے ذریعے نئے سرے سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا، بلکہ مقیس میں پہلے سے جو حکم موجود ہوتا ہے، قیاس کے ذریعے اسی کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ جب قیاس کی یہ حیثیت تسلیم ہے تو اس کے بعد قیاس کرنے کی وجہ سے اہلِ رائے کی بنیاد ہی ختم ہوجاتی ہے۔

کیا فقہائے احناف اہلِ رائے ہیں؟

ایک عرصہ ہوا کہ بعض طبقات کی جانب سے فقہائے احناف کے متعلق دیگر مجتہدین کرام کی بنسبت زیادہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور اہلِ رائے کہہ کہہ کر ان کی مذمت کی جاتی ہے، حالانکہ درج بالا سطور سے اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ خود اہلِ رائے ہونا کوئی مذمت کا متقاضی نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود حقیقتِ حال یہ ہے کہ جس طرح مجتہدین احناف کے ہاں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے ان کو خصوصی طور پر اہلِ رائے قرار دیا جاتا ہے، یوں ہی دیگر مجتہدین کرام کے ہاں بھی متعدد ایسی چیزیں موجود ہیں۔ فقہائے احناف کے بالمقابل عام طور پر شوافع کا ذکر آتا ہے اور ان کو حنفیہ کی بنسبت زیادہ عامل بالحدیث گردانا جاتا ہے، جبکہ ان کے ہاں بھی متعدد ایسے ضوابط موجود ہیں جن کی وجہ سے وہ حنفیہ کی بنسبت زیادہ اہلِ رائے قرار دیے جاسکتے ہیں۔

یاد رہے کہ شوافع کو اہلِ رائے قرار دینے کا مقصد ان کی مذمت کرنا نہیں ہے، بلکہ سیدنا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہو یا دیگر مجتہدین کرام، جن کے علم واجتہاد کو اُمت نے قبول کیا ہے، وہ سب ہمارے سروں کے تاج، اُمت کا سرمایہ اور بڑی قابلِ قدر ہستیاں ہیں، ہم ان کی گستاخی، مذمت اور بے ادبی سے ہزار ہزار بار اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔ یہاں تو صرف اصولی جائزہ لینا مقصود ہے کہ شوافع کی بنسبت حنفیہ کو اہلِ رائے کہنا اور ان کی طرف حدیث سے دور ہونے یا حدیث دشمنی کرنے کی نسبت کرنا بالکل درست نہیں ہے۔

قاضی محب اللہ بہاریؒ کی مفید تحقیق

علماء ہند میں سے حضرت علامہ قاضی محب اللہ بہاری رحمۃ اللہ علیہ کا اس موضوع پر ایک رسالہ ہے جو تلاش کے باوجود مطبوع یا مخطوط کسی شکل میں تو دستیاب نہیں ہوسکا، تاہم علامہ عبدالحئ حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے ''نزھة الخواطر'' میں موصوف کے حالات کے ضمن میں اس کا خلاصہ نقل فرمایا ہے۔ اس میں موصوفؒ نے سات ایسے ضوابط اور وجوہات ذکر فرمائے ہیں جن کی بنیاد پر احناف کا شوافع کی بنسبت زیادہ عامل بالحدیث ہونا اور شوافع کا اہلِ رائے ہونا واضح ہوتا ہے، وہ سات ضوابط اور وجوہات درج ذیل ہیں:

پہلی وجہ: حنفیہ کے نزدیک عام قطعی ہوتا ہے، چاہے اس کا تعلق قرآن کریم کے ساتھ ہو یا سنت رسول ﷺ کے ساتھ، لہٰذا قیاس ورائے کے ذریعہ اس کی تخصیص درست نہیں ہے، جبکہ شوافع کے نزدیک وہ ظنی ہوتا ہے اور قیاس کے ذریعے بھی اس میں تخصیص کی جاسکتی ہے۔

دوسری وجہ: حنفیہ کے نزدیک نصِ مطلق کو اپنے اطلاق پر برقرار رکھنا ضروری ہے اور قیاس کے ذریعہ اس کو مقید کرنا جائز نہیں ہے، جبکہ شوافع کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے۔

تیسری وجہ: حنفیہ کے نزدیک مرسل احادیث معتبر ہیں اور قیاس ورائے کی بنسبت وہی مقدم ہیں، جبکہ شوافع کے نزدیک عام حالات میں مرسل روایات کا اعتبار نہیں ہے اور قیاس ورائے کا درجہ اس سے مقدم ہے۔

چوتھی وجہ: صحابیؓ کی کوئی بات اگر ایسی ہو جو مدرک بالرأی نہ ہو تو حنفیہ کے نزدیک وہ سنت کے ساتھ ملحق ہے اور رائے وقیاس پر بہرحال اس کو مقدم رکھا جائے گا، جبکہ شوافع کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔

پانچویں وجہ: کسی عبادت میں جزء یا شرط کا اضافہ کرنا شوافع کے نزدیک تخصیص وتقیید ہے، لہٰذا قیاس ورائے کی بنیاد پر بھی ایسا کرنا درست ہے، جبکہ حنفیہ کے نزدیک ایسا کرنا اس کی حیثیت نسخ کی ہے، لہٰذا قیاس کا یہاں اعتبار نہیں ہے۔

چھٹی وجہ: حنفیہ کے نزدیک علت کے معتبر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ کسی نص یا اجماع سے اس کا مؤثر ہونا ثابت ہو، جبکہ شوافع کے نزدیک تاثیر کا ثابت ہونا ضروری نہیں ہے۔

ساتویں وجہ: حنفیہ حدود اور کفارات کے باب میں رائے وقیاس کے قائل نہیں ہیں، جبکہ شوافع کے نزدیک ایسا کرنا درست ہے۔ (۴)

آٹھویں وجہ: امام فخر الاسلام بزدوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''اصول بزدوی'' کے مقدمہ میں اس بات کی تفصیل ذکر فرمائی ہے کہ فقہائے حنفیہ اہلِ رائے ہونے اور اس میں سبقت کا مقام حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ حدیث وسنت پر عمل کرنے میں بھی دیگر مجتہدین کی بنسبت زیادہ فائق ہیں، اس ضمن میں ایک وجہ یہ بھی ذکر فرمائی ہے کہ ان کے ہاں مجہول راوی کی روایت قیاس ورائے پر مقدم ہے، جبکہ دیگر مجتہدین کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

''وأصحابنا هم السابقون في هٰذا الباب ولهم الرتبة العليا والدرجة القصوى في علم الشريعة ... وهم أولٰى بالحديث أيضًا ألا ترى أنهم جوزوا نسخ الكتاب بالسنة ... وقدموا رواية المجهول على القياس.'' (۵)

ترجمہ: ''اور ہمارے اصحاب اس باب میں آگے ہیں اور ان کو علمِ شریعت میں اونچی درجہ اور رتبہ حاصل ہے، اور ان کو حدیث میں بھی مہارت حاصل ہے، جیسا کہ انہوں نے کتاب اللہ کو

سنت کے ذریعے منسوخ ہونے کو جائز قرار دیا ہے اور مجہول روایت کو قیاس پر مقدم کیا ہے۔''

خلاصہ

ان وجوہات سے معلوم ہوا کہ رائے یا اہلِ رائے کا لفظ مطلقاً مذمت کے لیے استعمال نہیں ہوتا اور جن اسباب وضوابط کی بنیاد پر کسی جماعت کو اہلِ رائے قرار دیا جاتا ہے، وہ صرف فقہائے حنفیہ ہی کے ہاں نہیں ہیں، بلکہ دیگر فقہائے مجتہدین کے ہاں بھی ایسے مختلف ضوابط پائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ فقہائے شافعیہ کے ہاں حنفیہ کی بنسبت ایسی وجوہات کچھ زیادہ موجود ہیں جن کی بنا پر کسی جماعت کو اہلِ رائے میں سے گردانا جاتا ہے، اگرچہ اس سے فقہائے شافعیہ کی تنقیص، مذمت یا عیب جوئی مقصود نہیں ہے، بلکہ ان کے فقہی ذوق کو اُجاگر کرنا مطلوب ہے، کیونکہ رائے کے بغیر حدیث کے ظاہر ہی کو ہر جگہ مراد لینا کافی نہیں ہوتا۔ امام بزدوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''وقال محمد – رحمه الله تعالىٰ – في كتاب أدب القاضي: لا يستقيم الحديث إلا بالرأي ولا يستقيم الرأي إلا بالحديث حتى أن من لا يحسن الحديث أو علم الحديث ولا يحسن الرأي، فلا يصلح للقضاء والفتوى وقد ملأ كتبهٗ من الحديث، ومن استراح بظاهر الحديث عن بحث المعاني ونكل عن ترتيب الفروع على الأصول انتسب إلىٰ ظاهر الحديث.'' (٦)

ترجمہ: ''امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب ''أدب القاضي'' میں لکھا ہے کہ حدیث رائے کے بغیر صحیح نہیں ہوئی اور رائے حدیث کے بغیر صحیح نہیں ہوتی، یہاں تک کہ اگر کوئی حدیث یا علمِ حدیث اور رائے کو نہیں جانتا ہو اور اس کے کتب خانے حدیث سے بھرے ہوں، پھر بھی وہ قضاء اور فتوے کا اہل نہیں ہے، اور اگر کوئی معانی کی بحث میں ظاہرِ حدیث سے استدلال کریں اور اصول پر تفریعات کرنے سے انکار کریں تو ان کی نسبت ظاہرِ حدیث کی طرف ہوگی۔''

حواشی وحوالہ جات

١ – إعلام الموقعين عن رب العالمين، فصل تأويل ما روي عن الصحابةؓ من الأخذ بالرأي، الرأي على ثلاثة أنواع، ج:١، ص: ٥٣

٢ – فقه أهل العراق وحديثهم، ص:٣٢

٣ – كشف الأسرار شرح أصول البزدوي، العلم نوعان، النوع الثاني علم الفروع وهو الفقه، ج:١، ص:١٦

٤ – نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر، ج:٦، ص:٧٩٣

٥ – كشف الأسرار شرح أصول البزدوي، العلم نوعان، النوع الثاني علم الفروع وهو الفقه، ج:١، ص:١٥

٦ – كشف الأسرار شرح أصول البزدوي، العلم نوعان، النوع الثاني علم الفروع وهو الفقه، ج:١، ص:١٥